ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ ۵/۱، جنوری۔جون ۱۹۹۰ء

حکمتِ قرآن

حمید الدین فراہیؒ
ترجمہ: خالد مسعود

(استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ایک اہم غیر مطبوعہ تصنیف حکمۃ القرآن کی چوتھی اور آخری قسط "تدبر" لاہور کے شکریہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے) ادارہ

مذاہب میں عبادت کا تصور:

تمام امتوں کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ دین نام ہے رب کی بندگی اور اطاعت کا۔ ان کے درمیان جس باب میں اختلاف ہوا، وہ اسی حقیقت کی تفصیل میں اس وقت ہوا جب لوگوں نے اس میں اپنے ظن اور اپنی خواہشات کو شامل کر لیا۔ لہٰذا سب سے زیادہ اہمیت عبادت یا بندگی کی حقیقت کے صحیح فہم کو حاصل ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئیے کہ عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ چار چیزیں اس میں شامل ہوں:

(ا) **ربِ کریم کے لیے اخلاص:** یہ اخلاص توحید پر ایمان کے ساتھ مطلوب ہے اور اس امر کی وضاحت قرآنِ مجید میں بکثرت ہوئی ہے۔ عبادت کے درست ہونے کا بڑا انحصار اسی پر ہے اور عملی و علمی کج روی جو عبادت میں بگاڑ پیدا کرتی ہے اس کی نفی بھی اخلاص سے ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلات بہت طولانی ہیں جن کو ہم قاری کے فہم پر چھوڑتے ہیں۔ ان کو قرآن کی تصریحات کے مطالعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(ب) **مغزِ عبادت کی معرفت:** عبادت کا مغز رب کی طرف رجوع، اس کی پسند

کو خوشی کے ساتھ اختیار کرنا، اس کے آگے عاجزی کرنا، اس کے سامنے اپنی حاجتیں بیان کرنا اور اس سے اچھی توقعات وابستہ کرنا ہے۔ یہ ساری باتیں دو عبادتوں ۔۔ نماز اور قربانی میں جمع ہوگئی ہیں۔ اسی لیے کوئی بھی صحیح دین نماز اور قربانی کی عبادات سے کبھی خالی نہیں رہا۔ یہ لازم ہے کہ نماز اور قربانی اخلاص اور عاجزی کے ساتھ ہوں۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کی ظاہری شکل ہی عاجزی کی تصویر ہے۔ رہی قربانی تو اس کے پیش کرنے والے پر یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے۔ لہٰذا اگر اس کی عبادت خدا کے آگے انتہائی عاجزی اور محتاجی کے انداز میں پیش نہ ہوگی اور اس میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ شامل نہ ہوگا تو خدا اس کی قربانی کو حقارت سے ٹھکرا دے گا۔ اس بات کی وضاحت قرآن مجید نے ایک سے زیادہ آیات میں کردی ہے۔

(ج) **اللہ کی رضا کے رستہ پر چلنا:** یہ جن صفات پر مشتمل ہے ان کو ہم تقویٰ اور اعمالِ خیر سے تعبیر کر سکتے ہیں یعنی وہ اعمال جن کی ہدایت فطرتِ انسانی میں ہے یا جن کی تعلیم رب نے دی ہے۔ انہی سے بندے کی اس سعی کا اظہار ہوتا ہے جو وہ ایک کام کے کرنے اور دوسرے کو چھوڑنے میں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ کو پانے کی جستجو اور اس کی رضا کے مطابق رویہ اختیار کرنے کی کوشش اسی قبیل سے ہیں۔

جس شخص کے اندر اخلاص، نماز اور زکوٰۃ درست ہو جائیں تو لازم ہے کہ اس کے تمام اعمال درست ہو جائیں گے۔ ان تینوں میں غایت درجہ باہمی موافقت اور ایک ترتیب نظر آتی ہے اور انہی کی بدولت دین کے اجزا کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ ان کے بعد جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ اجزائے دین کی صورتِ ترکیب ہے جس پر ان کی حقیقت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

(د) **اجزائے دین کی ترکیب:** کسی بھی شے کی تکمیل اس کے نظام اور اس کی ترکیب سے ہوتی ہے یہی اس کا کمال اور اس کی خوبصورتی کی انتہا ہوتی ہے۔ یہ چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس شے کے تمام اجزا موجود ہوں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ بندہ اپنے اندر سب سے پہلے اخلاص کو، جو رب تعالیٰ پر ایمان سے حاصل ہوتا ہے، پھر دعاؤں اور نذروں کے ذریعے اس کی طرف رجوع اور انابت کو اور پھر تمام اعمال میں اللہ کی رضا کی طلب کو اس طرح جمع کرے کہ وہ اپنے

نفس اور اس کی خواہشات کی غلامی سے چھوٹ کر اپنے دین کو اپنے رب ہی کے لیے خالص کرے۔ اس کے بعد یہ ضروری ہوتا ہے کہ بندہ میانہ روی کی روش کا خیال رکھتے ہوئے ان میں کمال حاصل کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی ایک جانب سے غفلت کر کے دوسری جانب جھک جائے۔ یہ کمال اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو عالم بھی ہو اور اجزائے دین کی ایک دوسرے کے ساتھ نسبتوں سے بھی واقف ہو، پھر وہ اپنے ارادے پر اس قدر مضبوط گرفت رکھتا ہو کہ اس کا ارادہ اور اس کی پسند اس کے علم کے مطابق ہو جائے اور اس سے اس کے وجود کو ایسا اطمینان حاصل ہوتا ہو جس کے بعد اس کی عقل اور قلب کے درمیان، اس کے علم اور عمل کے درمیان، اس کے ظاہر اور باطن کے درمیان اور اس کی خواہش اور اس کے مولا کے درمیان کوئی مغائرت باقی نہ رہ جائے۔ جب کسی بندے کی عبادت میں پہلی تین خصوصیات کے ساتھ اجزا کی ترکیب کی یہ چوتھی خصوصیت شامل ہو جاتی ہے تو اس کی عبودیت کامل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک حکیم مرد مومن بن جاتا ہے۔ اس کا دین مضبوط اور اس کی راہ سیدھی ہو جاتی ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہوتی۔

اسلام میں تزکیہ اصل مقصود ہے :

مذکورہ بالا تمام امور بالکل واضح ہیں۔ ہم نے ان کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان کے نظام اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کے تعلق کی طرف توجہ دلائیں تاکہ قارئین کو اللہ کے دین میں حکمت کے مقام کا علم ہو سکے اور جو آیات اس نظام کی وضاحت میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں ان کے موقع و محل کی وضاحت ہو سکے۔ انہی میں سے وہ آیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کے بارے میں قرآن مجید کے کئی مقامات پر آئی ہے :

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آل عمران: ۱۶۴، جمعہ: ۲)

وہ ان کو اس کی آیات سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ چار صفات قرآن مجید میں چار مواقع پر آئی ہیں۔ پہلی مرتبہ ان کا ذکر سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت اور آپ کی امت کے بارے میں کی تھی۔ اس دعا میں تزکیہ کا ذکر باقی صفات کے بعد ہوا ہے جبکہ دوسرے تین مواقع میں تزکیہ کو تلاوتِ آیات کے بعد اور تعلیم کتاب و حکمت سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔ ان تینوں مواقع پر بغیر کسی فرق کے اسی ترتیب کا لحاظ ہے۔ جو شخص اس فرق پر غور کرے گا اس پر یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ تزکیہ اصل مقصود ہے جس کو پانے کے لیے کئی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ اس لیے حضرت علیہ السلام نے دعا میں اس کے ذکر کو مؤخر کر دیا۔ رہا دوسری آیات میں اس کو تعلیم کتاب و حکمت پر مقدم رکھنا تو یہ حضورؐ کی اصل ذمہ داری کو نمایاں کرنے کے لیے ہے۔

خلق و امر کے نظام میں موافقت کے پہلو :

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ موافقت پیدا کرنا یا تو کسی خاص مقصد کے حصول اور کسی متعین مدت کے لیے ہوتا ہے یا دائمی ہوتا ہے۔ پہلی قسم کی موافقت خلق اور امر کے دائرہ میں ہوتی ہے کیونکہ خلق تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کا خاص نظام بھی بدلتا رہتا ہے۔ جس طرح ایک ریل کی تصویر یکے بعد دیگرے سامنے آتی ہیں، اسی طرح ہر خلق کے ہمراہ اس کا نظام نظر آتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا امر بھی برابر حرکت میں رہتا ہے۔ دوسری قسم کی دائمی موافقت علم، ارادۂ عمومی اور آخرت کے انجام کے دائرہ میں نظر آتی ہے۔ ارادۂ عمومی اور آخرت کا انجام دونوں علم کے ساتھ ہیں۔ ایک حکیم کے علم میں باہم کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اسی لیے اس کو حکمت کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے ارادہ اور غایت میں بھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ارادہ غایت کے تابع ہوتا ہے اور غایت ایک ہی ہے جو آیت كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ (سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں) سے ظاہر ہے۔ پس علم کے نظام میں باطل کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ	ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ
فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ	اس کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے
وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ	کہ وہ نابود ہو کے رہے گا اور تمہارے

(الانبیاء : ۱۸) لیے اس چیز کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو بڑی خرابی ہے۔

یعنی تم لوگوں کی بدگمانی کے برعکس ہمارے ارادہ میں باطل کو دخل ہے اور نہ ہماری تدبیر میں اس کو راہ مل سکتی ہے۔

جب حکمت کا طالب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ خلق اور امر میں حق کے پہلو کو دیکھ سکتا ہے اور وہ اپنے علم کے سورج کی روشنی میں خلق و امر پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو متاعِ گم گشتہ مل جاتی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس پر مطمئن ہو جاتا ہے، اس کو اپنے علم اور معلومات کے درمیان اور اپنے ارادہ کے نظام اور اس کے خارج کے درمیان پوری مطابقت نظر آتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ کائنات اور اس کے خالق پر قناعت کر لیتا ہے۔ ارادہ کے نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی اس کو خوبصورت اور شاداب پاتا ہو، اس میں اس کو وہ منزل نظر آتی ہو جس تک پہنچنے کا وہ متمنی ہو۔ یہ سب کچھ صرف اس وقت ہوتا ہے جب آدمی کی فطرت پاک اور اعتدال پر ہو، جس طرح کہ اس کی تخلیق احسنِ تقویم پر ہوئی ہے۔

فلاسفہ کے علم کی نارسائی :

ہمارا علم محدود ہے اور ہم بہت کم جانتے ہیں لیکن ایسے علم کا شر جو اصل حقیقت کے خلاف ہو بے حد سنگین ہوتا ہے۔ اصل میں یہ علم کی صورت میں جہل ہوتا ہے، بالکل اس طرح جیسے بھیڑیئے نے میمنے کی کھال اوڑھ لی ہو۔ ارسطو نے جب یہ فلسفہ پیش کیا کہ حکمت تمام علوم کا احاطہ کر لینے کا نام ہے تو وہ غلطی پر تھا۔ چونکہ ایسا احاطہ اسے عملاً ناممکن نظر آیا اس لیے اس نے حکمت کو کلیات کے علم کے قالب میں ڈھال لیا اور اس کے لیے ایک نظام وضع کیا۔ بعد والوں نے کچھ دوسری ترتیبیں بھی تجویز کیں۔ کسی علم کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے لیے مختلف ترتیبیں تجویز کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں جو خرابی تھی وہ یہ تھی کہ یہ سارا کچھ محض معروضہ تھا جس میں حکمت نام کو نہ تھی۔ ارسطو نے اس خرابی کو بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے مابعد الطبیعات (METAPHYSICS) کو اعلیٰ حکمت قرار دیا۔ اس کے باوجود وہ ابتدائی وہم میں سے نکل نہیں

سکا اور اس نے امورِ عامہ کو حکمت کا موضوع قرار دے دیا۔ اس طرح وہ حقیقت تک رسائی کے معاملہ میں حجاب ہی میں رہا۔ اس پر یہ مقولہ صادق آگیا کہ علم خود سب سے بڑا حجاب ہے اپنے طور پر وہ علوم میں مشغول رہا لیکن علم اور عالم دونوں اس سے غائب ہو گئے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا باعث بنا۔

ارسطو کے بعد دوسرے فلاسفہ نے علم اور عالم کو موضوعِ فکر بنایا لیکن وہ اوہام میں اُلجھ کر رہ گئے اور علم کے سرچشمہ تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ شک و انکار کے تاریک بیابانوں میں سرگرداں پھرتے۔ سچ ہے:

مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (النور - ۴۰) جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔

جہالت تاریکی کی مانند ہوتی ہے۔ جس طرح بعض لوگوں کو اندھیرے میں بھوتوں کے دانت نظر آتے ہیں، اسی طرح کچھ لوگ کسی معاملے کی حقیقت تک نہ پہنچ سکیں تو ان کے اندر فاسد خیالات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ شک کے طوفانوں میں گھر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر ان کے علم نے جڑ نہیں پکڑی ہوتی، ان کو یقین کی ٹھنڈک نصیب نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ایک حکیم کے پاس جو علم ہوتا ہے، اس کی بدولت بہت سے امور سے اس کی بے خبری اس کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ نور پر تاریکی کبھی غالب نہیں آسکتی۔ چونکہ یہ بات اس کے علم میں ہوتی ہے کہ کسی غیر متعلق معاملے سے اس کی بے خبری اس کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں بن سکتی لہٰذا وہ اس بے خبری کا اقرار کرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ بکثرت باتوں میں یہ کہہ دیتا ہے کہ میں ان کو نہیں جانتا۔ اصل میں وہ اپنے علم کے محکم حصار کے اندر ہوتا ہے۔ وہ حکمت کی محکمات کے علم سے اطمینان حاصل کرتا ہے اور تقدیر کے معاملات جیسی متشابہات کے علم کو تقدیر بنانے والے کے سپرد کر دیتا ہے۔

انسان کے اختیار کی حکمت:

کائنات میں رحمت کا جاری ہونا کسی مجبوری کے باعث نہیں ہے۔ اگر اس کا سبب

مجبوری ہوتی تو اس کو رحمت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ وہ تخلیق کرے۔ پھر رحمت کی تکمیل کے لیے اس نے نعمت کی تکمیل کی۔ رحمت کی تکمیل ہی کی خاطر یہ ضروری ہوا کہ وہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو اس بات کی اہلیت رکھتی ہو کہ اس پر نعمت تمام کی جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایسی مخلوق بنائی جو اس کے قریب ہو سکے اور اس کے اوصاف کو اختیار کر سکے۔ یہ اوصاف اس سے مشابہت کے طور پر نہیں بلکہ اس کے ساتھ موافقت کے لیے ہوں، بالکل اس طرح جیسے حُسن کے لیے عشق اور نور کے لیے بصارت موافق صفات ہیں۔ اس موافقت کو سمجھنے میں فلاسفہ اور ان کے ماننے والوں نے غلطی کی اور یہ گمان کر لیا کہ انسان کی تخلیق رحمان کی صورت پر ہوئی ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ وہ معبود سے مشابہت اختیار کر لے۔

انسان پر نعمت کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اختیار اور اعلیٰ مراتب کے لیے رغبت کی صفات رکھیں۔ یہیں سے اس کے اندر شر، کج روی اور خواہشاتِ نفسانی کو در آنے کی راہ ملی۔ اس اختیار کا مقصود اصلی یہ تھا کہ خدا کے شکر اور اس کی طرف انابت کے فضائل آدمی کو حاصل ہوں اور وہ عفو و مغفرت کی خوبیوں کو جان سکے تاکہ وہ رب کریم کی نظرِ عنایت، اس کی رافت، عفو اور اس کی رضا کے پانے کا اہل ہو سکے۔ رحمت کی انتہا رب کی طرف سے درگزر اور وسیع مغفرت ہے۔ اگر اختیار نہ ہوتا تو نعمت کی تکمیل نہ ہوتی اور اگر بندے گناہ نہ کرتے تو رحمت کی وسعت میں کسر رہ جاتی۔ لہٰذا انسان کو جو اختیار ملا ہے یہی وہ چیز ہے جس نے اس کو اعلیٰ مراتب کے حاصل کرنے کا اہل بنایا ہے۔ یہ رب کی رحمت کا مظہرِ اتم ہے۔ بندہ اپنے اختیار سے خدا سے منہ موڑتا ہے۔ پھر جب وہ اس اعراض کا کڑوا مزا چکھ لیتا ہے تو اسی اختیار سے وہ رب کی طرف لازماً متوجہ بھی ہوتا ہے۔ تب وہ اس سے اس کی رحمت اور معافی کا طالب ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں خدا کی رحمت بھی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

مذاہب میں گمراہی کے داخل ہونے کے اسباب:

مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی گمراہی کا سبب نفس اور رب کے پہچاننے میں ان

کی غلطی ہے۔ انہوں نے ایک صحیح بنیاد پر پوری نگاہ نہیں ڈالی اور دوسری صحیح بنیاد سے اغماض برت لیا کیونکہ وہ ان مختلف بنیادوں کے مابین موافقت نہیں کر پائے۔ ہندومت، بدھ مت، مجوسیت، یہودیت اور نصرانیت جیسے عام مذاہب میں گمراہی شاید ان کے غلو، بدعات اور خواہشاتِ نفس کی راہ سے داخل ہوئی ہے۔

جہاں تک ہندومت کا تعلق ہے، اس کے ماننے والوں نے توحید کے معاملے میں غلو سے کام لیا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ وجودِ ذات کو ہم قدیم سے تعبیر کریں یا 'میں' سے، یہ ایک ہی بات ہے۔ اس گمان کے نتیجہ میں ان کا دعویٰ یہ ہوگیا کہ 'اہم برہم' یعنی 'میں اللہ ہوں'۔ اس حقیقت تک رسائی کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ دنیا کو تیاگ دیا جائے اور ذات کو فنا کیا جائے۔ انہوں نے اپنی ہمت کے مرکز کو حقیقت کی صورت دے لی۔ یہی 'میں' کی حقیقت ہے۔ اس کے بعد انہوں نے یقین کر لیا کہ اس حقیقت کو پانے کے محکم قواعد موجود ہیں۔ جو شخص ان پر عمل کرنے کی مشقت اٹھائے گا، وہ مراد کو پالے گا۔ رب کی طرف سے کسی رسول کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ رب تو خود آدمی کی اپنی ذات ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے نہایت مشکل مجاہدوں کا طریقہ اختیار کیا اور نفس کے انوار اور اس کی قوت کی بدولت وہ دھوکے میں پڑ گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندومت میں یہ جو کچھ ہوا یہ ان کے رشیوں کے غلو کے سبب سے ہوا۔ کیونکہ ان میں بعض ایسے ہندو بھی ہیں جو ایک قدیم معبود، جو ہر چیز کا خالق اور انسان کو ہدایت عطا فرمانے والا ہے، پر یقین رکھتے رہے ہیں۔ بعد کے ادوار میں ہندو چھ فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کے عوام پر بت پرستی غالب آگئی۔

ہمارے اندر صوفیاء کے ساتھ بھی بعینہٖ یہی صورت پیش آئی۔ البتہ یہ ہوا کہ ان کے اندر بعض صوفیاء نے کتاب وسنت کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ ان سے رہنمائی حاصل کرنے پر زور دیتے رہے اور غیبی انوار سے کسی دھوکے میں مبتلا نہیں ہوئے۔ انہوں نے یہی سبق دیا کہ اللہ تعالیٰ 'وراء الوراء ثم وراء الوراء' یعنی ہر چیز سے آگے اور آگے ہی آگے ہے۔

ایک حکیم کا مذاہب پر غور کرنے کا طریقہ:

ایک حکیم کسی مذہب پر غور کرتا ہے تو اس کے پیشِ نظر تین چیزیں ہوتی ہیں:

اوّلاً مذہب کا وجود اور اس کا نظام۔ اس میں حکیم مذہب کے اجزاء اور مقصود کے ساتھ اس کے تعلق کو دیکھتا ہے اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ان اجزا میں اس مقصود کو حاصل کرنے کی صلاحیت کس قدر ہے۔ پھر وہ اس مذہب کے اندر حق اور بدعات پر نگاہ ڈالتا اور ان میں امتیاز کرتا ہے یہ بات اس کے لیے اس بنا پر ممکن ہوتی ہے کہ وہ خود حق کا حامل ہوتا ہے اور وہ کسوٹی اس کے پاس ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اصل اور فرع کے درمیان امتیاز کر سکے۔

ثانیاً، دوسرے مذاہب کے ساتھ اس کی نسبت۔ اس پہلو سے ایک حکیم یہ دیکھتا ہے کہ مختلف مذاہب میں کس قدر مشابہت ہے۔ ایک نے دوسرے کا کتنا حصہ جذب کیا ہوا ہے اور اصل اور فرع کے لحاظ سے ان میں کیا تعلق ہے۔

ثالثاً، ثابت شدہ حقائق کے ساتھ اس کی نسبت: ایسے حقائق میں فطرتِ انسانی اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ شامل ہے۔

تحقیق میں حکیم کی بنائے استدلال:

ہر مذہب میں کسی نہ کسی کتاب، نقل یا علمی ورثہ کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ اس کے ماننے والے اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور اس کے احکام کو مانتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ بھی ہوا ہے کہ اس مذہبی کتاب یا علم میں تبدیلی یا تحریف ہو چکی ہے۔ لیکن ایک حکیم پر اس تبدیلی یا تحریف کے باعث مذہب کا معاملہ گڑبڑ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مذاہب فطرتِ انسانی پر مبنی ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ان کے ابتدائی صحیفوں کا باہمی اختلاف بہت کم ہے۔ وہ ان میں موافقت تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا سبب اس کی اپنی عادت اور حق کی خصوصیت ہوتی ہے۔ حکیم کے اندر جانچ اور حق کی جستجو کا مادہ ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ محض منسوب کردہ تعلیمات اور باطل علم میں سے بھی سچی بات کو الگ کر لیتا ہے۔ وہ خزف ریزوں میں سے جواہر کو نکال لیتا ہے۔ اس عمل میں اس کا انحصار دو بنیادوں پر ہوتا ہے: ایک یہ کہ حق میں ایک طرح کی نورانیت اور فطرت میں ایک بصیرت ہوتی ہے۔ ان دونوں میں ایسی موافقت ہوتی ہے جیسے فطرت حق ہی کا آئینہ ہو۔ دوسری یہ کہ کسی معاملے میں شہادتوں کا پے در پے

جمع ہونا بہت بڑی بات ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ پس جب کسی معاملے میں فطرت کی تمام حسیات کی شہادت موجود ہو، اللہ تعالیٰ نے جو وحی اتاری ہے وہ معاملہ اس سے موافقت رکھتا ہو اور سلف کی عقلیں اس پر متفق رہی ہوں تو اس بارے میں کسی شک کا احتمال نہیں رہ جاتا۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت

یاد رہے کہ ایمان باللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی تین صفاتِ کمال، رحمت، قدرت اور حکمت پر ایمان لانا ہے۔ ان تینوں صفات کے دائرہ میں دوسری تمام صفاتِ جلال وصفاتِ جمال داخل ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا قدیم ہونا، اس کا ہمیشہ باقی رہنا، اس کا زندہ جاوید ہونا، اس کا علم، سخاوت، خلاقی، بادشاہی، بے نیازی، عزت، حلم، تدبیر، اس کا ہدایت دینا، دعا سننا، خلق پر نظرِ عنایت کرنا، فضل کرنا، معاف کرنا، مظلوم کا انتقام لینا، حق وعدل کے مطابق فیصلہ کرنا اور اس کے علاوہ وہ تمام صفات جن کی طرف اسمائے حسنیٰ رہنمائی کرتے ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان تین صفاتِ کمال پر ایمان لے آتا ہے۔ اس کو ایمان باللہ کے باقی ارکان کی ہدایت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ:

مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (تغابن: ۱۱) اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کی رہنمائی کرتا ہے۔

اس مضمون کو دیگر کئی آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

جو شخص رب کو ان کامل صفات کے ذریعے پہچان لیتا ہے تو اس کے اندر لازمی طور پر شکر اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کو خدا کی نعمتوں میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ اگر وہ خدا کا شکر ادا نہ کرے تو یہ اس کی اکڑ اور حق تلفی کی دلیل ہے اور اگر خدا کو سب سے بڑھ کر محبوب نہ رکھے تو ایسا شخص شکر کا حق ادا نہیں کرتا۔ مزید برآں یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس شخص کے اندر فطرتِ انسانی کے احساسات کا شعور کامل نہیں۔ فطرتِ انسانی جلال وجمال کو محبوب رکھتی ہے۔ اگر فطرت کا یہ پہلو معدوم ہو جائے تو انسان چوپایوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ اثر اس کی فطرت کے اخلاقی پہلو کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ باقی رہا اس کا علمی پہلو تو ہم مختصر

طور پر اس کو بھی واضح کرتے ہیں۔

رب تعالیٰ کو اس کی صفاتِ کمال کے ساتھ پہچاننے کی کوشش کرنا۔ انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ جس طرح حقائق کے ادراک کے نتیجہ میں طبیعت کے اندر تمام معارف ابھر آتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے نتیجہ میں انسان رب کو پہچاننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں اس مسئلہ کو ثابت کرنے کا موقع نہیں، بلکہ مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ قرآنِ مجید کے نصوص کی رو سے دین کا نظام کیا ہے۔ اس بارے میں قرآن نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ رب تعالیٰ پر ایمان انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ آگے ایسے مباحث آئیں گے جو اس مسئلہ کو واضح کر دیں گے۔ یہاں میں ایک معترض کی طرح خود ہی یہ سوال کرتا ہوں کہ میں نے خلق کی جانب سے صرف شکر ہی کو کیوں واحد جذبہ قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ انسان کے نفس میں دوسرے بھی کئی جذبے ہیں مثلاً ایک عظیم اور قاہر رب کے لیے اس کے اندر خوف اور ایک صانع اور ماہر رب کے لیے حیرت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے چنانچہ عام مذہبی گروہوں کے مذہب کی بنیاد خوف پر اور اکثر فلاسفہ کے مذہب کا مدار حیرت و استعجاب پر ہے پھر یہ بات بھی ہے کہ باری تعالیٰ کے مظاہر میں انہی دو قسموں کے مظاہر کی کثرت ہے اور یہ انسان سے قریب تر اور اس کے لیے واضح تر بھی ہیں۔ اسی لیے انسان معمولی غور و فکر کے بعد ان پر متنبہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور
وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ	زمین کو کس نے پیدا کیا تو کہیں گے کہ
الْعَلِيمُ ۝ (الزخرف: ۹)	ان کو عزیز و علیم ذات نے پیدا کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ رب کی اس پہچان کا سبب یہی ہے کہ کائنات میں اس کی عظمت اور صناعی کے نشان نہایت واضح ہیں۔

باری تعالیٰ کی پہچان کے لیے صرف اس کی صفاتِ قدرت و صنعت پر انحصار کیا جائے تو یہ شرک کی نفی تو کر دیتی اور مزید غور و فکر پر ابھارتی ہیں، لیکن آدمی جب تک صفاتِ ربوبیت و رحمت کا ادراک نہیں کرتا وہ دین تک نہیں پہنچ پاتا۔ کیونکہ یہ وہ صفات ہیں جو

غایت کی حیثیت رکھتی ہیں اور صفاتِ حکمت و قدرت انہی کی خاطر ہیں۔ جب آدمی کا غور و فکر اس کو یہاں تک لے آتا ہے تو وہ ربوبیت کی معرفت حاصل کر لیتا اور یہ جان لیتا ہے کہ باری تعالیٰ ہی رحمان و رحیم ہستی ہے۔ اس وقت اس کو رب کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اس کا شکر ادا کرتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے۔ اس حقیقت پر قرآن سے کئی شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں۔

رب تعالیٰ کی صفات پر ایمان اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ آخرت پر بھی ایمان لایا جائے اور کتابِ الٰہی کی آواز کانوں میں پڑے تو اس پر بھی ایمان لایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کے اندر خدا کے پیغام کے لیے پیاس موجود ہے۔ وہ اس کی ملاقات کا مشتاق ہے، اس کے ذکر سے وہ سکون پاتا ہے، وہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو خدا کی طرف بلائے اور اس کے ہاں سے کوئی خبر لائے۔ یہ تمام کام اس جذبہ محبت ہی کے مظاہر ہیں جو شکر سے پیدا ہوتا ہے۔

ایمان کے ثمرات :

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ پہلا کام رب تعالیٰ کی ان نشانیوں پر غور کرنا ہے جنہوں نے آفاق و انفس کو بھر رکھا ہے اور جو صفاتِ جلال و جمال کے کامل ہونے کی دلیل ہیں۔ دوسرا کام جو پہلے ہی کا نتیجہ ہے وہ خدا کے لیے شکر و محبت کے جذبات کا پیدا کرنا ہے۔ اسی سے بندہ خدا کی رضا کا طالب ہوتا، اس کے آگے عاجزی اور فروتنی اختیار کرتا اور اس سے امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہی ایمان کے ثمرات ہیں۔ اس سے نفس کی آلودگی دور ہوتی ہے اور بندہ تزکیہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی ہے کہ دل کی بعض مشغولیتیں شکر و محبت کا جذبہ پیدا ہونے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان کے سبب سے بندہ نادر صورتوں کے سوا کسی ایسے شخص کا محتاج ہوتا ہے جو اس کو خبردار کرے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے آبا و اجداد، قوم و قبیلہ کے زیر اثر نشو و نما اور تربیت پاتا ہے۔ وہ ان سے جو کچھ سنتا ہے وہی بات اس پر غلبہ پا لیتی ہے۔ اس فوری جذبہ کی خواہشات اور ذاتی مشغولیت کے زیر اثر وہ عام طور پر خیالات اور اخلاق میں انہی کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ ایسے لوگ بہت نادر ہوتے ہیں جو اللہ

کی آیات میں غور و فکر کرنے پر از خود متنبہ ہوتے ہیں۔ یہ انبیاء اور حنیف لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے متنبہ ہونے کے بعد جن لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں وہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت مغلوب نہیں ہوئی ہوتی۔ وہ حق کی طرف بلانے والے کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ جو کبھی تو فوراً ہوتا ہے اور کبھی اس میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس کا انحصار آدمی کے غور کرنے کی استعداد اور اس کے حسنِ اخلاق پر ہوتا ہے۔ انسان کو فطرت میں جو بھی صلاحیتیں حاصل ہیں۔ ان میں ہم اسی چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی کے باعث وہ فنون کا عالم اور ماہر بنتا اور حسنِ اخلاق کے زیور سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی میں استعداد نہ ہو تو وہ سیکھ ہی نہیں سکتا۔ گویا پہلی تعلیم سن کر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد غور و فکر سے آتی ہے۔ اس سے اگلے مرحلہ میں اس ہدایت کے قبول کرنے سے آتی ہے۔ جس پر انسان کی فطرت پیدا کی گئی ہے۔ ادراک کی قوت ہو یا قوتِ ارادی دونوں کی فطرت حقیقت میں حق اور خیر ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ تمام قوتیں جس طرح استعمال کی جا سکتی ہیں اور اس سے وہ اصلاح پاتی اور ترقی کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ بے کار چھوڑی جا سکتی ہیں، ان کو بگاڑا جا سکتا ہے اور یہ فنا بھی ہو سکتی ہیں۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ دین اسلام انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اب آیئے اس دین کے نظام کو سمجھیں۔

دین کے نظام کی بنیادیں:

دین کے نظام کی اولین بنیاد عدل ہے۔ یہ عقل اور اخلاق کا نقطہ امتزاج ہے۔ حسنِ اخلاق کا مطمعِ نظر احسان ہے۔ اسی کا ایک پہلو ان حقوق کا ادا کرنا ہے جو کسی شخص پر واجب ہوں۔ یہی شکر ہے۔ لہٰذا شکر عدل میں داخل ہے۔ جس شخص پر یہ حقیقت کھل جائے کہ اس کے رب کے جو احسان اس پر ہیں ان کا حق اس پر واجب ہے تو اس شخص کے اندر شکر کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ شکر کی ادائیگی کو واجب قرار دینا عدل کا تقاضا ہے۔ آخر اس کا کیا جواز ہے کہ آپ تمام نعمتیں تو بلا معاوضہ حاصل کریں اور ان کے جس حق کی ذمہ داری آپ پر ہے اس کو ادا نہ کرنا چاہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔